

میرے قابل احترام اساتذہ کرام

(۵)

مدینہ منورہ میں قیام... اور مدینہ یونیورسٹی میں میرے اساتذہ

از: مولانا مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی

یہ ۱۹۶۲ء کی ایک صبح تھی، میں دارالعلوم دیوبند میں اپنی درسگاہ میں بیٹھا ہوا درس دے رہا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تعلیمات کا ایک چراسی ناظم تعلیمات حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ کی جانب سے ایک حکم لے کر آیا کہ ساتھ میں دی گئی عربی تحریر کا اردو ترجمہ کر کے دے دیا جائے۔

میں نے دیکھا تو وہ سعودی سفارت خانے کی طرف سے ایک خط تھا جس میں لکھا گیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، دارالعلوم دیوبند سے کسی کا انتخاب کر کے بھیجیں، ترجمہ کر کے تعلیمات کو بھیج دیا گیا۔

دوپہر کے کھانے پر میں نے والد صاحب حضرت قاری جلیل الرحمن عثمانی سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ... تم بھی اپنی درخواست بھیج دو۔

اس واقعہ سے تھوڑے دن پہلے کی بات ہے... والد صاحب کسی کام سے کتب خانہ محمودیہ میں آئے... دوران گفتگو اچانک ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا... کیا تم حج کو جانا چاہتے ہو، میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، گفتگو کے موضوع سے اس جملہ کا کوئی تعلق نہ تھا، میں نے پوچھا تو کہنے لگے ”بس یوں ہی خیال سا آ گیا تھا“۔

مجھے اپنے انتخاب کی امید نہ تھی، بس تعمیل حکم میں درخواست بھیج دی... تعلیم کے آخری سال ”دورہ حدیث“ کے نمبروں کے حساب سے انتخاب میرا ہو گیا... اور یوں اس مرد فقیر (والد محترم) کا خیال، خیال سے آگے بڑھ کر واقعہ بننے لگا۔

آب زمزم کی برکت

ان ہی دنوں پاؤں پر شدید ورم تھا، والد صاحب کے ساتھ حکیم محفوظ علی صاحب کو (جو کہ

دیوبند کے پرانے اور حاذق حکیم تھے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے عزیز قریب اور پڑوسی تھے) دکھانے کے لئے گیا، انھوں نے دیکھ کر بڑی تشویش ظاہر کی اور بتایا کہ یہ ”فیل پا“ کی بیماری کا آغاز ہے پاؤں پھول کر ہاتھی جیسے ہو جاتے ہیں، اس لئے اس بیماری کو فیل پا (ہاتھی کا پاؤں) کہا جاتا ہے۔ پھول کر کھال پھٹنے لگتی ہے، زخم ہو جاتے ہیں اور آدمی چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ سفر کی بات آئی تو انھوں نے کہا میں اس کا مشورہ نہ دوں گا، بیماری کا آغاز ہو چکا ہے، علاج اور دیکھ بھال کی شدید ضرورت ہے۔

میں نے اب دیدہ ہو کر کہا... آخر انجام موت ہو سکتا ہے، موت ہی آتی ہے، تو اس سے اچھی موت کون سی ہوگی کہ ارض مدینہ میسر آجائے گا۔ پاسپورٹ سے لے کر ڈاکٹری سرٹیفکیٹ تک کتنے کتنے مرحلے آئے، بہر حال وہ طے ہوتے گئے اور دس بارہ دن کے اندر اندر ظہران، ظہران سے جدہ اور جدہ سے مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ میں چند روز قیام رہا۔ شیخ محمد سلیم صاحب اس وقت مدرسہ کے مہتمم تھے۔ اس زمانے میں تبلیغی جماعت کا مرکز بھی یہی ہوتا تھا... ایک بڑے سے ہال میں کھانا رہنا، سونا سب ہوتا تھا، پانی کی اس زمانے میں اتنی فراوانی نہ تھی، جتنی ماشاء اللہ اب ہے... ایک ریال میں ایک بالٹی ملتی تھی۔

عمرہ کیا، آب زمزم خوب جی بھر کے پیا جاتا تھا، سنا تھا زمزم شریف میں شفا ہے، سنی سنائی بات چشم دید بن گئی، کچھ دن میں ہی فیل پا کی تکلیف جاتی رہی۔

توکل کا مزہ

مدینہ طیبہ پہنچے، یونیورسٹی میں جا کر انٹرویو دیا، بھائی رشید الوحیدی صاحب ساتھ تھے، ان کا اور میرا داخلہ ”انقسم العالی“ میں ہو گیا... رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو چکا تھا، جیب بالکل خالی تھی، کچھ لوگوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کی اسکا لرشپ ایڈوائس بھی مل جاتی ہے، پتہ نہیں کیوں کہنے کو دل نہ مانا، کھانے کے لئے پیسے نہ تھے... مگر ہوتا یہ تھا کہ مسجد نبوی ﷺ میں درس کے بعد آ جاتے تھے اور کوئی نہ کوئی دعوت کرنے والا مل جاتا تھا، دیوبند کے مولانا انعام کریم صاحب مدینہ طیبہ میں تھے، ان کی وجہ سے بھی بڑا سہارا مل جاتا تھا، سحری اکثر ان کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ غرض پورا مہینہ بغیر پیسوں کے بھی آرام سے گزر گیا، کچھ وہاں کی پاکیزہ فضا کا اثر تھا کہ کوئی فکر نہ ہوتی تھی، توکل کا مزہ وہیں رہ کر آیا۔

حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی صاحب کی خدمت میں

مدینہ طیبہ کے قیام میں ایک بہت بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب کی خدمت میں رہنے کا موقع مل گیا، مولانا بدر عالم صاحب علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے، نہایت بلند علمی ذوق رکھتے تھے، فیض الباری عربی زبان میں مولانا بدر عالم صاحب کی مشہور تالیف ہے، جو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ترجمان السنہ احادیث کا ایک بہترین مجموعہ ہے اس پر مولانا کی نادر و نایاب تشریحات... جن لوگوں کو اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ اس میں مولانا کی علمی بصیرت کے جوہر دیکھ سکتے ہیں۔

علمی مقام کے علاوہ مولانا صاحب باطن بھی تھے۔ پہلے ان کا تربیتی تعلق میرے دادا حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ سے رہا... ان کے وصال کے بعد دادا صاحب کے جانشین حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی سے تعلق ہوا اور ان کے جانشین بنے۔ مدینہ طیبہ حاضری سے پہلے ہی میں نے مولانا کو بچپن ہی میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ دیوبند ہمارے گھر تشریف لائے، ہمارے گھر نماز کے چبوترے پر وضو کرتے ہوئے ایک نہایت حسین و جمیل شخصیت کا خاکہ میرے ذہن میں تھا۔

جب میں مدینہ طیبہ پہنچا تو جاتے ہوئے اس قسم کے خیالات ذہن میں تھے کہ میاں ہوں گے کوئی مولانا وولانا... یعنی یہ خیال تھا کہ ہمارے وہاں رہتے ہوئے کہیں مولانا نے روک ٹوک کی تو ہمیں ان کی کوئی زیادہ پروا نہیں ہے، لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ مدینہ طیبہ پہنچ کر جب مسجد نبوی ﷺ میں حاضری ہوئی تو میرے شوق کا عالم یہ تھا کہ روضہ اقدس پر حاضری سے پہلے میں مولانا کی خدمت میں جانا چاہتا تھا اور دل کہتا تھا کہ جلدی سے مولانا کی خدمت میں پہنچ جاؤں... مولوی اور مسٹر کے درمیان کچھ اپنا ہی الگ انداز... ٹوپی کی مناسبت سے سر کے بال ذرا بڑھے ہوئے اور ان کی تراش ایسی کہ نہ انگریزی معلوم ہوں اور نہ انگریزیت سے باہر ہوں... غرض نوعمری کا وقت لا ابالی پن اور دماغ میں آزاد خیالی... اس حلیہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر جاتے رہے ایک دن ایسا ہوا کہ اس لباس اور بالوں کی وضع قطع سے بڑی وحشت معلوم ہونے لگی، دل چاہتا تھا کہ کپڑے اتار کر ابھی پھینک دوں، ان بالوں کو نوچ ڈالوں اور مدینہ طیبہ کا عربی لباس پہنوں۔ اکثر مولانا کی خدمت میں عصر کے بعد حاضری ہوتی تھی۔ اس دن بڑی بے تابی

کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، جیب میں پیسے ویسے کچھ نہیں تھے... مسجد نبوی ﷺ کے قریب ہی بمبئی کے عبداللہ صاحب ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان کرتے تھے، ان سے جا کر صورت حال بتائی کہ پیسے تو اس وقت میرے پاس ہیں نہیں اور دل چاہ رہا ہے کہ ابھی اسی وقت عربی لباس پہنا جائے... انھوں نے بڑی شفقت اور محبت سے ہمیں کپڑے دیئے اور کہا کہ کوئی بات نہیں جب پیسے ہوں گے دے دینا۔ ہم جلدی سے نائی کی دوکان پر پہنچے... سرمٹہ وایا اور نہادھو کر عربی لباس پہنا اور معمول کے خلاف عشاء کے قریب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا دیکھ کر کھل اٹھے... معذور ہو گئے تھے، بستر پر لیٹے رہتے تھے، اسی حالت میں ہاتھ بڑھا کر سینے سے لگایا، آب دیدہ ہو کر پیشانی چومی اور فرمانے لگے اس وقت کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا، مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو کہ اجازت ہوتی تو تمہاری تصویر کھینچ کر اپنے پاس رکھ لیتا۔

یہ دراصل ہمارے ذہنی انقلاب کا نقطہ آغاز تھا جو بالکل اس شعر کی تعبیر تھا۔

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مولانا بلاشبہ مرد مومن ہی نہیں بلکہ مومن کامل اور ولی کامل تھے، جتنا عرصہ ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی وہ میری زندگی کا سب سے سنہرا دور تھا۔ ان کا انداز تربیت ہی بڑا نرالا تھا، ہلکی سی بات میں دل و دماغ کی دنیا الٹ کر رکھ دیتے تھے، ذوق ان کا بڑا نفیس اور پاکیزہ تھا... ایک روز فرمانے لگے کہ جب میاں آفتاب (جو مولانا کے اکلوتے صاحبزادے ہیں) کی والدہ کا انتقال ہوا تو اس وقت میں جوان تھا، حضرت قاری اسحاق صاحب میرٹھی نے کئی بار مشورہ دیا کہ شادی کرلو۔ جب حضرت نے کئی بار فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت بات یہ ہے کہ میاں آفتاب کی والدہ کو میں نے اتنے برسوں میں سکھایا تھا کہ چائے کی پیالی طشتری میں کیسے رکھتے ہیں، اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ نئی آنے والی کو طشتری میں پیالی رکھنا سکھا سکوں۔ مولانا کے کمرے میں بہت صاف ستھرا قالین بچھا ہوا تھا۔ شام کے وقت تمام حاضرین کو خوبصورت صاف ستھرے، بجانوں میں عربی چائے پیش کی جاتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ چائے پینے والے چائے پی کر فحان قالین پر رکھ دیتے تھے۔ میں اس معاملے میں بڑی احتیاط کرتا تھا، کبھی خالی فحان قالین کے اوپر نہیں رکھتا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ مولانا میری اس بات کو نوٹ کرتے ہیں، مگر ایک دن ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ میرا یہ انداز انہیں بہت پسند ہے۔

بات انداز تربیت کی چل رہی تھی... ایک روز فرمانے لگے ”حنفی مسلک کا سب سے مشکل

مسئلہ کون سا ہے، جس کو ثابت کرنا خفیوں کے لئے بڑا دشوار ہوتا ہے...؟ ہم نے تیر تک لڑا کر فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر اس طرح کے مسائل بتانے شروع کئے... فرمایا نہیں! خفی مسلک کا سب سے مشکل مسئلہ وتر کا ہے جس کو ثابت کرنے میں خفیوں کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ یہ فرما کر حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی عربی کتاب ”کشف الستور عن صلوٰۃ الوتر“ مجھے دی اور فرمایا کہ اس کا غور سے مطالعہ کرے آنا۔

حیا آنکھ کی ہوتی ہے یا علم کی

ایک مرتبہ مولانا نے ناچیز سے سوال کیا... ہلال میاں یہ بتاؤں کہ حیا کا تعلق علم سے ہے یا نظر سے...؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ حیا کا تعلق نظر سے ہے... میرے کپڑوں کے نیچے میرے اعضاء کا مجھے بھی علم ہے اور آپ کو بھی، پھر بھی ہم کپڑوں سے بدن کو ڈھکتے ہیں اسلئے نہیں کہ ہمیں علم نہیں ہے کہ کپڑوں کے نیچے کیا ہے؛ بلکہ اس لئے کہ حیا آنکھ کی اور نظر کی ہے... اس طرح چھوٹی چھوٹی گفتگو سے مولانا ذہن کے گوشے کھولتے رہتے تھے۔

جواہر الحکم کی ترتیب

حضرت مولانا اس زمانے میں ”جواہر الحکم“ کے نام سے احادیث کا ایک عام فہم مجموعہ مرتب فرما رہے تھے، جواب تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے... مولانا صاحب فراش تھے اور لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکے تھے، جواہر الحکم کی ترتیب اور تحریر میں مولانا نے مجھے کام کرنے کا حکم دیا۔ میری عربی تحریر صاف ستھری تھی، کیوں کہ میں نے باقاعدہ کتابت سیکھی تھی... مولانا میری تحریر دیکھ کر بہت مسرور ہوئے، پہلے حدیث کا عربی متن مجھ سے لکھوا لیتے تھے اور ترجمہ اور تشریح بولتے رہتے تھے اور میں لکھتا رہتا تھا... اسی زمانے میں میں نے دیکھا کہ مولانا علم حدیث میں کیسی گہری نظر رکھتے ہیں۔ مشکوٰۃ میں کوئی حدیث تلاش کرنی ہوتی تھی تو ہمیں اس کے ڈھونڈنے میں دیر لگ جاتی تھی، مگر مولانا ہاتھ سے ٹول کر اوراق کا اندازہ کر کے بتا دیتے تھے کہ دیکھو فلاں حدیث یہاں ہوگی اور اکثر وہیں یا ایک آدھ ورق آگے پیچھے مل جاتی تھی۔

اسی زمانہ میں ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آیا کہ مولانا بیمار تھے ہی، ان کی علالت نے شدت اختیار کر لی اور حالت ایسی ہو گئی کہ جیسے بس چند لمحوں کے مہمان ہوں... اسی حالت میں اشارے

سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کان کے پاس منہ لے جا کر فرمایا کہ فلاں حدیث فلاں جگہ لکھ لو۔ چند روز بعد اللہ نے حالت بہتر کر دی... میں نے ادب سے عرض کیا کہ اس روز جب آپ کی حالت کافی نازک تھی آپ نے مجھے بلا کر یہ بات ارشاد فرمائی تو اس موقع پر یہ بات کہنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے...؟ مولانا نے فرمایا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت شاید بہت نزدیک ہے تو میں چاہتا تھا کہ حدیث کی خدمت کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہوتا تاکہ صاحب حدیث کی شفاعت نصیب ہو سکے... مولانا کے اس جواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی روح کس طرح عشق نبوی ﷺ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اسی زمانے میں ایک روز ایسا ہوا کہ مسجد نبوی ﷺ کے خدام روضہ شریف کی خاک پاک لے کر مولانا کی خدمت میں آئے تو مولانا نے اشارہ کیا کہ مجھے سہارا لگا کر بٹھا دو اور بڑے ادب کے ساتھ اس خاک پاک کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے باچشم غم فرمایا ”میں نہیں جاسکتا تو وہ خاک پاک بھیج دیتے ہیں“۔

ایک مرتبہ بڑی غیر معمولی بات ارشاد فرمائی جس کی عام طور پر ظاہر کرنے کی مولانا کی عادت نہ تھی... فرمایا کہ جب میں صحت مند تھا اور چلتا پھرتا تھا تو ایک روز مسجد نبوی ﷺ میں ستون سے ٹیک لگائے ہوئے درود شریف پڑھ رہا تھا تو میرے منہ میں کسی نے کوئی چیز پٹکائی اس کی مٹھاس اور خوشبو کی میں کوئی مثال نہیں دے سکتا، عجیب و غریب شیرینی اور دلنواز خوشبو تھی، اس کا ذرا لقمہ جیسے اب بھی محسوس ہوتا ہے۔

ایک روز بڑی خاص کیفیت میں فرمانے لگے کہ میاں کیا سمجھتے ہو حضرت قاری صاحب مدینہ طیبہ تشریف لا کر بارگاہ نبوت سے میرے بارے میں سب کچھ طے کر کے گئے ہیں اور وہی سب پیش آرہا ہے۔ غرض یہ کہ مولانا کا وجود اور ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت میرے لئے سب سے سنہری موقعہ تھا۔

عربوں کی سادگی اور بے تکلفی اور ان کے بلند اخلاق

اب تک عربوں کی خصوصیات کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سنا تھا اب اپنی آنکھوں سے نظر آ رہا تھا اور تجربہ ہو رہا تھا... عربوں میں عجیب طرح کی بیساختگی اور سادگی ہے، ملتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے نچھا اور ہو جائیں گے... نہ کوئی بناوٹ ہوتی ہے نہ تصنع... بڑی بے تکلفی اور اپنائیت کا

احساس جیسے بہت پرانے ملنے والے ہوں۔ آپ کو محسوس بھی نہیں ہوگا کہ آپ اجنبی سے مل رہے ہیں۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے، اچھے الفاظ سے خوشی کا اظہار اور پھر ان کے دعائیہ جملے ان لوگوں سے مل کر لطف آجاتا تھا۔

کئی بار ہم لوگ کسی گاؤں میں چلے جاتے تھے، وہاں بھی ہمارے علاقوں کی طرح چوپالیں بنی ہوتی تھیں، جس میں بہت سے لوگ جمع رہتے تھے... بڑھ کر ایسا استقبال کرتے تھے جیسے ہمارے آنے کے منتظر ہوں... اور پھر چائے اور کھانے سے تواضع ہوتی تھی، سخاوت کا سبق تو کوئی عربوں سے سیکھے، پیار سے کھلائیں گے کہ جیسے آپ کے نہ کھانے سے ان کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ بار بار تقاضہ کریں گے کہ بھائی یہ تو دیکھو اس کو تو چکھو... ذرا سی دیر میں اجنبیت کے پردے اٹھ جائیں گے اور آپ کو بے پناہ اپنائیت کا احساس ہوگا۔

عرب وعدے کے پابند

عرب لوگ وعدے کے کتنے پابند ہوتے ہیں اس کا ذاتی طور پر مجھے وہاں رہنے کے زمانے میں تجربہ ہوا... وہاں ایک ایجنٹ تھے جو طلبہ کے سفر وغیرہ کا انتظام کیا کرتے تھے، جب میں چھٹیوں میں آنے کے لئے ٹکٹ بنوانے لگا تو میرے پاس تین سو ریال کم تھے۔ میں نے اس ایجنٹ سے (جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کہا کہ میرے پاس اتنے ریال کم ہیں، اگر آپ مجھے دیدیں تو میں آنے کے بعد واپس کر دوں گا... انھوں نے کہا کہ اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں لیکن اگر کوئی انتظام ہو گیا تو میں تمہیں ضرور دے دوں گا... میں نے کسی دوسری جگہ سے انتظام کر لیا اور آنے کے لئے جدہ ایئر پورٹ پر پہنچا... اس وقت جدہ ایئر پورٹ شہر کے اندر تھا اور اتنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے اور نہ اتنی قانونی پابندیاں تھیں... میں جہاز میں سوار ہونے کے لئے اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ مجھے کسی کے پکارنے کی آواز آئی۔ دیکھا کہ وہ ایجنٹ بھاگے چلے آ رہے ہیں... قریب آ کر مجھے تین سو ریال دینے لگے۔ میں نے کہا اب تو انتظام کر لیا ہے، اب ضرورت نہیں مگر انھوں نے اصرار کیا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا، اب تم ان پیسوں کو رکھ لو، میں نے کہا میں اب ہندوستان جا رہا ہوں، میرے وہاں کس کام آئیں گے، تو وہ دوڑ کر گئے اور ریال کو ہندوستانی کرنسی میں بدلو کر جلدی سے واپس آ گئے۔ مجھے مجبوراً وہ پیسے رکھنے پڑے... اندازہ لگائیے کہ یہ کردار کہیں جلدی سے دیکھنے کو ملتا ہے...؟

مدینہ والوں کی نرم روی

مدینہ طیبہ میں رہنے والوں کے دل بہت نرم ہیں... اگر کچھ لوگ لڑ رہے ہوں اور آپ ان کے سامنے جا کر کہہ دیں ”صل علی محمد“ وہ ساری لڑائی بھول جائیں گے اور زبانوں پر درود جاری ہو جائے گا... ان کے دلوں میں جیسے محبت کے دریا بہتے ہیں۔ مجھے لیو پولڈ ولس یعنی علامہ محمد اسعد کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ”روڈ ٹو مکہ“ میں مدینہ طیبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ مدینہ محبت کا شہر ہے، یہاں محبت بارش کی طرح برستی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول مقبول ﷺ کا مسکن یہ پیارا شہر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے دنیا میں نرالا ہے... آپ وہاں رہ کر ایسا محسوس کریں گے جیسے آپ بچے ہوں اور اپنی ماں کی گود میں ہیں... اتنے نرم دل اور جلدی اعتبار کرنے والے لوگ ہیں کہ ہر شخص پر اپنے بھائی کی طرح بھروسہ کر لیتے ہیں، کیوں کہ خود صاف دل ہیں اس لئے دوسروں کو بھی اپنی طرح ہی سمجھتے ہیں۔

مدینہ کے لوگوں کی انکساری

ہم نے مدینہ طیبہ کے لوگوں کی انکساری کا یہ عالم دیکھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اگر اپنی کار میں جارہے ہیں اور انھوں نے آپ کو پیدل جاتے ہوئے دیکھ لیا تو فوراً آپ کے قریب لا کر گاڑی روکیں گے اور آپ کو بیٹھنے کی دعوت دیں گے... ان میں بالکل کوئی احساس برتری نہیں ہوگا کہ ہم استاذ ہیں یہ شاگرد ہیں، یا ہم بڑے ہیں یہ چھوٹے ہیں... سلام کرنے میں پہل کریں گے اور شفقت و محبت کا معاملہ کریں گے۔

یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ شاہ فیصل یونیورسٹی میں آئے... تفسیر کے استاذ شیخ محمد امین شنفیطی درس دے رہے تھے... قریب میں ایک پرانی سی کرسی پڑی ہوئی تھی جو اب یعنی چہر اسی کے لئے تھی... شاہ فیصل نے اسی کرسی کو آگے کیا اور شیخ کے قریب بیٹھ گئے۔ اصرار کے باوجود دوسری اچھی کرسی پر نہیں بیٹھے اور کافی دیر تک انہماک کے ساتھ شیخ کی تقریر سنتے رہے۔

شیخ شنفیطی

شیخ شنفیطی کا ذکر آیا ہے تو دل چاہتا ہے کہ چند باتیں ان کے بارے میں عرض کر دی

جائیں۔ شیخ شنفیطی مالکی مسلک کے تھے، تفسیر و قرآن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اسلوب قرآن کے تعلق سے ہزاروں اشعار ادب جاہلیت کے ان کو حفظ تھے، شعر پہ شعر پڑھتے چلے جاتے تھے اور اسلوب قرآن اور اس کے انداز بیان کی اس طرح وضاحت کرتے تھے کہ قرآن کے معانی اور مطالب نکھر کر سامنے آ جاتے تھے... شیخ پرانی وضع قطع کے علماء میں سے تھے لیکن نہایت روشن فکر تھے... اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارے علماء دین بصیرت کے ساتھ جب تک سائنسی علوم حاصل نہیں کریں گے اور ہمارے نوجوان جدید علوم سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اس وقت تک فکری غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا، کیوں کہ اس وقت یورپ کے افکار دنیا میں چھائے ہوئے ہیں اور ان کا جواب ان کی زبان میں دینا ہوگا... بڑے خوش مزاج اور مشفق استاذ تھے... افسوس ہے کہ ایسے عالم سے عالم عرب بلکہ عالم اسلام محروم ہو چکا ہے۔

شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ

یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایک بڑے ممتاز استاذ شیخ ناصر الدین البانی تھے... سبل السلام کا درس انہیں کے پاس تھا... اب تو وہ اپنی تصانیف کے ذریعے عالمی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں پہلے خفی تھا اور اب خفی مسلک کو خیر آباد کہہ چکا ہوں... اس میں شک نہیں کہ بڑے قابل اور وسیع المطالعہ عالم دین تھے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے خلاف ان کی تنقید میں بڑی جارحیت تھی جو علمی تنقید کی حدود سے باہر ہو جاتی تھی... ایک مرتبہ کرسی پر بیٹھے درس دیتے ہوئے پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور کتاب ان کے پاؤں پر رکھی ہوئی تھی... میں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ ادب سکھانے والے کو خود با ادب ہونا چاہئے، کتاب آپ کے پاؤں پر رکھی ہے... شیخ نے انکساری کے ساتھ غصاً کہہ کر معذرت کی... یہ بھی ان کی وسعت ظہنی کی بات تھی۔

شیخ عطیہ سالم رحمۃ اللہ علیہ

یونیورسٹی میں عربی ادب کے استاذ شیخ عطیہ سالم تھے... بڑے مستعد، بیدار مغز اور طلباء کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرنے والے... دیکھنے میں بڑے وجیہ اور دراز قد، سنہری کمانی کا چشمہ لگائے ہوئے... زبان بڑی سلیس اور صاف تھی اور ان کے درس میں طلباء بڑے شوق کے ساتھ شرکت کرتے تھے... افسوس ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

عبدالمحسن العباد رحمۃ اللہ علیہ

یونیورسٹی میں ایک استاذ منکسر المزاج باخلاق عبدالمحسن العباد تھے... عربی بہت جلدی جلدی بولتے تھے... لہذا ایسا تھا کہ الفاظ سمجھنے میں مشکل پڑتی تھی، مگر آدمی قابل اور ذی استعداد تھے۔

شیخ العبودی رحمۃ اللہ علیہ

یونیورسٹی کے رجسٹرار یعنی مسجّل تھے... بڑے بیدار مغز اور وسیع المعلومات اور روشن فکر ہیں الحمد للہ حیات ہیں اور اکثر ملکوں کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ کچھ سال پہلے اسلام آباد ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے گیا تو معلوم ہوا کہ عبودی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ فوراً کارلے کر ان کے ہوٹل کی طرف دوڑا مگر افسوس میرے پہنچنے سے پہلے جا چکے تھے... دل کو بڑا اقلق ہوا کہ ملاقات کا موقعہ نہیں مل سکا۔

شیخ بن باز رحمۃ اللہ علیہ

یونیورسٹی کے نائب رئیس یعنی وائس چانسلر اس زمانے میں شیخ عبدالعزیز بن باز تھے... شیخ بصارت سے محروم تھے، مگر صاحب بصیرت تھے، بڑا وسیع علم رکھتے تھے اور چچی تلی بات کیا کرتے تھے... ”نعم“ ان کا تکیہ کلام تھا، ہر جملہ پر یہ لفظ نکلتا رہتا تھا... ہم لوگ کبھی طالب علمانہ انداز میں شیخ سے الجھ جاتے تھے مگر شیخ بڑے تحمل سے جواب دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز انھوں نے جامعہ کی مسجد میں پڑھائی اور بھولے سے دو رکعتیں پڑھا کر قبلے کی طرف پشت کر کے عصر کی تسبیحات پڑھنے لگے، کسی نے یاد دلایا تو اسی پر بنا کر کے عصر کی چار رکعتیں پوری کر لیں۔ نماز کے بعد میں نے شیخ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے مشہور حدیث جس کو حدیث ذوالیدین کہا جاتا تھا اس کا حوالہ دیا... یہ حدیث اس طرح سے ہے کہ ایک صحابی تھے جن کا لقب لمبے لمبے ہاتھ ہونے کی وجہ سے ذوالیدین (ہاتھوں والے) پڑ گیا تھا۔ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے چار رکعت والی کوئی نماز پڑھائی اور بھولے سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا، یہ صحابی جن کا لقب ذوالیدین تھا انھوں نے دریافت کیا ”أقصررت الصلوة ام نسیت یا رسول اللہ؟“ کیا نماز اللہ کی طرف سے کم ہوئی ہے یا اللہ کے رسول آپ بھول گئے ہیں...؟ رسول پاک ﷺ نے باقی دو رکعتیں پوری فرمادیں، میں نے عرض کیا یہ تو ابتدائی دور کی بات ہے جب کہ نماز اپنی اس مکمل شکل تک نہیں پہنچی تھی۔ شیخ نے کہا تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے...؟ غرض اس طرح کی علمی انداز کی بحثیں ہوتی

رہتی تھیں اور شیخ عقدہ کشائی فرماتے رہتے تھے... شیخ کے تعلق سے ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پاکستان سے آئے ہوئے تھے تو شیخ بن باز نے ان سے سلسلہ حدیث کی سند حاصل کی۔

شیخ بن باز ۱۹۱۲ء میں ریاض میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی آنکھیں دُکھنے آگئیں جس کی وجہ سے آپ کی نگاہ کمزور ہو گئی اور ہوتے ہوتے ۱۹۳۱ء میں جب کہ آپ کی عمر بیس سال تھی پورے طور پر بینائی سے محروم ہو گئے۔

مگر بینائی سے محرومی ان کی تعلیم کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکی۔ نوعمری میں ہی آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا... اور ستائیس سال کی عمر میں علوم شرعیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ فراغت کے بعد آپ کو ”خرج“ کے علاقے میں قاضی مقرر کر دیا گیا۔

عدالت کی ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۵۴ء میں شیخ بن باز خرج سے ریاض منتقل ہو گئے اور وہاں بھی آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا جب ۱۹۵۵ء میں ریاض میں ”کلیۃ الشریعہ“ کا قیام عمل میں آیا تو شیخ بن باز وہاں درس دینے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ مدینہ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور نو سال کے بعد آپ کو چانسلر بنا دیا گیا۔ پانچ سال تک بن باز صاحب مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر رہے۔

اسکے بعد آپ کو مملکت سعودیہ کا مفتی اعظم مقرر کیا گیا۔ آپ کی خصوصیت یہ رہی کہ آپ نے کسی کی پروا کیے بغیر ہمیشہ حق کے مطابق بات کہی، اسلئے آپ کے فتاویٰ انتہائی معتبر سمجھے جاتے تھے۔ بہ حیثیت ایک طالب علم کے حضرت شیخ بن باز کی زندگی کے مختلف گوشوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے جذبات بڑے تعمیری تھے۔ عالم اسلام کے اتحاد کے ہمیشہ متمنی رہتے تھے۔ افسوس ہے عالم اسلام کا یہ مایہ ناز سپوت ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء کو طائف میں اہل علم کو یتیم کر کے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مکہ مکرمہ کی مسجد حرام میں بعد نماز جمعہ ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ”اُم القری“ کے تاریخی قبرستان ”جنۃ المعلی“ میں علم کے اس خزانے کو دفن کر دیا گیا۔

مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات

مدینہ طیبہ کے زمانے میں مولانا مودودی سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر بڑے عجیب انداز سے۔ ہوا یہ کہ مغرب کی نماز کے لئے مسجد نبویؐ میں پہنچا تو نماز کھڑی ہو چکی تھی، حاجیوں کی آمد کا زمانہ

شروع ہو چکا تھا، اس لئے مسجد بھر جاتی تھی اور نماز کی صفیں باہر سڑک تک پہنچ جاتی تھیں۔ میں جب پہنچا تو باب مجیدی کے باہر صف میں جگہ ملی۔ میں نے دیکھا کہ میرے برابر میں ایک صاحب ململ کا کرتا اور اونچے باڑکی بالوں والی ٹوپی پہنے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں، میں نماز کے بعد ان کو دیکھتا رہا... میں نے کبھی نہ تو مولانا مودودی کو دیکھا تھا، نہ ان کی تصویر دیکھی تھی... میرے ذہن میں ان کا تصور کچھ ایسا تھا جیسے اس زمانے میں ہفت روزہ چٹان میں عطاء اللہ شاہ بخاری کی تصویر چھپا کرتی تھی... مگر اس روز ان صاحب کو اپنے برابر میں نماز پڑھتا دیکھ کر نہ جانے کیوں بار بار یہ خیال ہوتا رہا کہ کہیں یہ مولانا مودودی تو نہیں ہیں۔ نماز کے بعد بھائی رشید الوحیدی مل گئے، میں نے ان سے کہا کہ مجھے لگتا ہے مولانا مودودی آئے ہوئے ہیں اور پھر میں نے ان کو یہ بات سنائی۔ اس وقت مدینے میں مسجد نبوی کے قریب بس دو ہی ہوٹل ہوا کرتے تھے، جس میں زیادہ مشہور ”قصر المدینہ“ تھا... بھائی رشید کہنے لگے ان دونوں ہوٹلوں میں دیکھ لیتے ہیں پتہ لگ جائے گا۔ مسجد کے بالکل سامنے قصر المدینہ تھا، ہم لوگ پہلے وہیں پہنچے اور کاؤنٹر پر جا کر معلوم کیا تو پتہ لگا کہ مولانا مودودی فلاں کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم لوگ اس کمرے میں پہنچے اور مولانا سے ملاقات کی، تعارف ہوا، تو دیوبند اور چچا عا مر عثمانی کے حوالے سے مولانا بہت خوش ہوئے، ہم نے ان سے کہا کہ یونیورسٹی کے بارے میں جو مضامین ہم نے پڑھے تھے اور جو تعارف ہمارے سامنے آیا تھا وہ معیاری تھا، لیکن یہاں وہ علمی رنگ اور وہ وسعت جو ہمارے خیال میں تھی نظر نہیں آئی۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی تو شاہ سعود نے مجھ سے اس کا خاکہ تیار کرنے کے لئے کہا تھا، میں نے جو نقشہ تیار کیا تھا وہ ایک عالمی یونیورسٹی کا تھا، لیکن شاہ کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ملکی علماء کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور پھر انھوں نے ایک رسالہ ”المسلمون“ جنیوا سے شائع ہوتا تھا وہ ہمیں دیا کہ آپ اس کو پڑھیں، اس میں یونیورسٹی کا وہ خاکہ اور پوری تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے کہا کہ آپ اس کو غنیمت سمجھیں کہ آپ کو اس بہانے مدینہ طیبہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوگئی ہے... بہر حال یہ ملاقات جو عجیب انداز میں ہوئی تھی، بڑے خوش گوار ماحول میں ختم ہوئی۔

قیام مدینہ کا ایک حیرت انگیز واقعہ

قیام مدینہ کے زمانے میں ایک بڑا حیرت انگیز واقعہ میرے ساتھ پیش آیا... ہوا یہ کہ کچھ

حساب کتاب کی وجہ سے یونیورسٹی کی اسکا لرشپ کئی مہینے تک کسی کو نہیں مل سکی... ہمارے پاس تھوڑے سے پیسے تھے جو جلد ہی ختم ہو گئے۔ جس دن آخری ریال ہمارے پاس تھا تو یہ سوچ کر کھانا کھانے کے لئے گئے اور اکثر ہم ”مطعم پاکستان“ کے نام سے مسجد نبوی کے سامنے ایک ہوٹل تھا اسی میں کھانا کھایا کرتے تھے، جس کے مالک بڑے لمبے چوڑے کالے رنگ کے تھے، مگر خوش اخلاق تھے اور کھانا بھی ان کے یہاں اچھا ملتا تھا، اس زمانے میں دس قرش میں ایک پلیٹ سالن کی آ جاتی تھی اور چار قرش کی موٹی سی روٹی جس کو ”عیش“ کہتے تھے مل جاتی تھی۔ اس طرح چودہ قرش میں آرام سے پیٹ بھر جاتا تھا اور ایک ریال میں بیس قرش ہوتے تھے... اس دن ہم نے باقی چھ قرش کی بڑی سی گلاب جامن بھی کھائی اور آخری ریال ہوٹل والے کے حوالے کرنے کے لئے چلنے ہی والے تھے کہ ہوٹل کے مالک نے کہا آپ کافی دنوں سے ہمارے یہاں کھانا کھاتے ہیں، حساب کیوں نہیں کھول لیتے...؟ میں نے کہا بھائی آج کل پیسے نہیں مل رہے ہیں اور معلوم نہیں کب ملیں گے، پھر آپ تقاضہ کریں گے، ہوٹل کے مالک نے کہا کہ جب پیسے آئیں گے دینا، تقاضا نہیں کروں گا اور یہ کہہ کر کاپی اس نے میرے سامنے رکھ دی کہ جاتے ہوئے اس صفحہ پر اپنا حساب لکھتے جایا کریں۔ آج یہ بڑی عجیب بات تھی، اتنے دنوں سے ہم اس کے یہاں کھانا کھاتے تھے اور نقد پیسے ادا کر دیتے تھے، آج ادھار پر اصرار ان کی طرف سے ہو رہا تھا اور ہم بچ رہے تھے۔ جب انھوں نے کئی بار اصرار کیا تو ہم نے یہی سمجھا کہ یہ دراصل اللہ کی طرف سے شہر رسول ﷺ میں ہماری مہمانی کا انتظام ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے شہر میں ہوں اور بھوکے رہ جائیں، اللہ کا شکر ادا کر کے کھانا کھاتے رہے، جب پیسے آئے تو ہوٹل والے کو ادا کر دیئے۔

ایک بات جو وہاں کے لوگوں میں ہم نے دیکھی وہ ہے ایک دوسرے پر اعتماد اور حسن ظن کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے کاپی پر حساب لکھا ہو اور ہوٹل مالک نے اس کو چیک کیا ہو کہ غلط تو نہیں لکھ گئے۔ مدینے کی فضاؤں میں یہ باہمی اعتماد اتنی بڑی نعمت ہے جو وہاں کے معاشرے کو پاکیزگی سے ہم کنار کرتی ہے۔

وہاں بعض دوکانیں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مال پانچ ریال یا دس ریال میں ملتا تھا... آپ بیگ لے کر جو سامان پسند آئے اس میں ڈالتے چلے گئے، واپسی میں دوکان دار کو بتا دیجئے کہ کتنے عدد ہیں، اس کے مطابق وہ پیسہ لے لے گا، کبھی یہ نہیں کہے گا کہ دکھاؤ نا اتنے ہی ہیں زیادہ تو نہیں۔ اس باہمی اعتماد سے عجیب سی یگانگت اور محبت پیدا ہوتی ہے... اس لئے علامہ اسعد

(لیوپونڈولیس) نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ محبت کا شہر ہے۔

جدہ ریڈیو پر

اسی زمانے میں ہم نے مدینہ یونیورسٹی پر ایک چھوٹی سے کتاب لکھی اور اس کو چھپوایا۔ ہندوستان میں بھی اور سعودی عرب میں بھی اس کے بڑے چرچے رہے۔ جدہ ریڈیو سے شام کو اردو کا پروگرام آیا کرتا تھا، اس میں کئی بار اس کتاب کے بارے میں بڑا اچھا پروگرام نشر کیا گیا، پہلے جدہ ریڈیو پر اردو پروگرام کے ڈائریکٹر مولانا عبداللہ عباس ندوی تھے جو بعد میں ام القری یونیورسٹی میں چلے گئے اور آج کل ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ”معمد تعلیم“ بھی ہیں... ان کی جگہ پر نثار احمد ندوی اردو پروگرام میں آگئے تھے، ہمارے بھی بہت سے پروگرام مختلف موضوعات پر جدہ ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے تھے... اس وقت ریڈیو اسٹیشن کسی بڑی عمارت میں نہیں تھا، شہر کے اندر ہی تھا۔ کیوں کہ سعودی عرب کی ترقیات اس وقت شروع ہی ہوئی تھیں... نثار صاحب کو ہمارا انداز پسند آیا تھا، انھوں نے کہا کہ آپ ریڈیو پر آجائیں، مجھے امید ہے کہ آپ کو آسانی سے لے لیا جائے گا۔ ہم نے کہا کہ تعلیم سے فارغ ہوئیں تو پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔

مدینہ یونیورسٹی پر ہم نے جو چھوٹی سی کتاب لکھی تھی وہ یونیورسٹی میں بھی پسند کی گئی... ہندوپاک کے جو لوگ یونیورسٹی دیکھنے آتے تھے ان کو اردو کا یہ پمفلٹ یونیورسٹی کی طرف سے دے دیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی نے ہم کو اس پر چھ سو ریال کا انعام بھی عطا کیا... مگر ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ جس کی وجہ سے ہم نے نقد انعام کے بجائے اس کی کتابیں لینی پسند کیں... ہوا یہ کہ جب یہ انعام ہمارے لئے منظور ہوا تو ہم شیخ بن باز کے کمرے میں ان سے ملنے کے لئے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے گئے جیسا کہ بتایا گیا کہ شیخ نابینا تھے، جب ہم ان کے کمرے میں داخل ہونے لگے تو ایک صاحب جو مسلک اہل حدیث تھے، دروازے کی طرف پشت کئے ہوئے شیخ کے سامنے بیٹھے تھے اور ہمارے بارے میں شیخ کو الٹی سیدھی پٹی پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے... ہم دروازہ کھول کر اندر جانے لگے تو چوں کہ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی، انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہیں لگا اور ان کے کچھ جملے ہم نے سن لئے... ہمیں بڑا غصہ آیا اور شیخ کے سامنے ہی ان کی اچھی خاصی خبر لی، ہم نے شیخ سے کہا کہ غالباً یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے پیسوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، آپ ہمیں نقد انعام کے بجائے کتابیں دیدیں تو زیادہ بہتر ہے۔

نجد کے لوگ زیادہ تر خنبلی ہیں اور تنگ ذہن نہیں ہیں... یونیورسٹی کا ماحول بڑا پرسکون اور پر امن رہتا تھا... کبھی کبھی بڑی دلچسپ اور لطیف انداز کی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی۔ ایک سال کے بعد جب ہم چھٹیوں میں ہندوستان آئے تو ہمیں شادی کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۲ء کو ہماری شادی ہوئی اور اگست کے پہلے ہفتے میں چھٹیاں ختم ہونے پر واپس آنا پڑا رمضان المبارک کے مہینے میں ایک روز ایک صاحب نے بلیک بورڈ پر قرآن مجید کی یہ آیت خوش خط لکھ دی...: احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم هن لباس لکم و انتم لباس لهن۔ (حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں لطف اندوز ہونا اپنی بیویوں سے وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو) کلاس عبدالحسن العباد کی تھی... ہم نے احتجاج کیا کہ یہ آیت بلیک بورڈ پر لکھ کر ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے، کیوں کہ ہم اپنی بیویوں کے دور ہونے سے اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس پر بہت ہنسی اور تہقہبہ ہوئے اور شیخ بھی اس سے لطف اندوز ہوئے۔

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات

یوں تو ہم مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس زمانے سے جانتے تھے، جب وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے... اس وقت وہ نوجوان تھے اور ہم لوگ طالب علمی کی زندگی گزار رہے تھے... مولانا سے ملاقات کر کے ہم طلباء کو بڑا مزہ آیا کرتا تھا کیوں کہ مولانا ہمارے ساتھ بہت بے تکلفی سے پیش آتے تھے... قیام مدینہ کے زمانے میں مولانا کالج کے لئے تشریف لانا ہوا تو یہیں ان کے ساتھ حج کرنے کی سعادت نصیب ہوئی... منیٰ میں ان کا اور ہمارا خیمہ برابر برابر تھا درمیان میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لئے اور نشست و برخاست کے لئے چھوڑی ہوئی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے مولانا عصر کی نماز سے پہلے اس جگہ میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے، ہم بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اور ان کو لکھتا ہوا دیکھتے رہے، جب وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے ان سے کہا کہ آپ چائے پیئیں گے...؟ مولانا نے کہا کہ ہاں پلاؤ، تھکن معلوم ہو رہی ہے۔ ہم باہر کے ہوٹل سے ان کے لئے چائے لے کر آئے، پرانی سی کیتلی تھی اور فنجان بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے، ابھی ہم نے چائے لا کر رکھی ہی تھی کہ اتنے میں مولانا کے میزبان جو غالباً سعودیہ کے ہی رہنے والے تھے بہت خوبصورت ٹرے میں نفیس قسم کے فنجان اور خوبصورت کیتلی کے ساتھ چائے لے کر آئے... اس چائے کے مقابلے میں ہماری چائے بہت

معمولی نظر آرہی تھی... مولانا نے ہمارے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر بڑی اپنائیت کے ساتھ دوسرے آنے والوں سے کہا کہ آپ لوگ چائے لیجئے، ہم تو ہلال میاں کی چائے پیئیں گے... بات معمولی سی تھی لیکن مولانا کی شفقت اور ان کے بلند اخلاق کا نہ مٹنے والا نقش ہمارے دل پر چھوڑ گئی... کبھی لکھنؤ جانا ہوتا تھا پرسنل لار بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے تو مولانا کے وہی دل کو موہ لینے والے انداز ہوتے تھے... برابر میں بیٹھے ہوئے کچھ نہ کچھ سامنے رکھ دینا اور بڑی محبت سے کہنا کہ بھئی یہ بھی تو کھائیے... یہ حسن اخلاق اور بلند کردار اور یہ شفقت اور مروت و محبت اس کے نمونے اب کہاں نظر آتے ہیں۔

مولانا سید محمود صاحب سے ملاقات

مدینہ طیبہ کے قیام کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر وہاں کی ایک انتہائی محترم شخصیت مولانا سید محمود صاحب کا تذکرہ نہ کیا گیا... مولانا سید محمود صاحب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے... حکومت اور عوام سب جگہ انتہائی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے... ان کے بیٹے سید حبیب صاحب مدینہ کے گورنر رہ چکے تھے۔ مولانا سید محمود صاحب کا تعلق حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب سے بھی بڑا عقیدت مندانہ تھا۔ اکثر ملاقات کے لئے تشریف لایا کرتے تھے اور وہاں ہمیں بھی ملنے کا موقع ملتا تھا، بلکہ باب مجیدی کے قریب وہ مکان جس میں مولانا بدر عالم صاحب کا قیام تھا وہ سید محمود صاحب کا ہی تھا۔

ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں میں اور بھائی رشید صاحب سید محمود صاحب کے مکان پر ان سے ملاقات کے لئے گئے... ان کا مکان مسجد ابو بکر کے قریب تھا، وقت بھی گرمی کا تھا اور موسم بھی... ہم جب ملاقات کے کمرے میں پہنچے تو سید محمود صاحب کمرے میں پسینے میں نہائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر انھوں نے ایئر کنڈیشنڈ آن کر دیا اور چند منٹ میں کمرہ ٹھنڈا ہو گیا... ہمارے لئے بہت عمدہ قسم کا شربت منگوا یا اور محبت آمیز گفتگو فرماتے رہے... ہم نے ہمت کر کے عرض کیا کہ سید صاحب ہم لوگ جب حاضر ہوئے تو آپ پسینے میں نہائے بیٹھے تھے، ایئر کنڈیشنڈ ہوتے ہوئے آپ گرمی میں بیٹھے رہے، ہم لوگوں کو اس پر حیرت ہے۔

اس کے جواب میں سید صاحب نے جو فرمایا وہ بڑا نصیحت آمیز ہے... کہنے لگے کہ جب ہم مدینہ طیبہ میں آئے تو بڑی مفلسی کی حالت تھی، ایک چھوٹا سا مکان اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا وہ اب

بھی موجود ہے، کبھی آپ کو لے جا کر دکھائیں گے، میں مشینوں کا کام جانتا تھا، محنت کرتا تھا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا، آج آپ محل نما مکان دیکھ رہے ہیں، کبھی کبھی دل چاہتا ہے اپنے نفس کو یہ بات یاد دلادی جائے کہ کبھی تمہاری کیا حالت تھی، بس اسی خیال سے پسینہ آنے کے باوجود اسے سی نہیں چلایا کہ پرانی یاد تازہ رہے اور اس عیش و عشرت کی عادت نہ پڑ جائے... سید صاحب کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ شاہ سعود کی دعوت کی، دعوت کے بعد شاہ نے اپنی طرف سے ایک اعلیٰ ترین کار تحفے میں بھیجی۔ سید صاحب نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ہم دعوت کی قیمت نہیں لیتے۔ شاہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہم اپنے بھائی کو منانا جانتے ہیں... جس شخص کی عزت اور احترام کا یہ عالم ہو وہ اپنے پرانے وقت کو یاد رکھے اس سے بڑھ کر اعلیٰ کردار کون سا ہو سکتا ہے۔

آخری بات

مدینہ منورہ کا قیام اپنے ساتھ اتنی یادیں اور باتیں لئے ہوئے ہے کہ اس کا ذکر ختم کرنے کو دل نہیں چاہتا... وہاں کے لوگوں کا اخلاق، ان کی مروت، ان کی سخاوت، حقیقت یہ ہے کہ عرب کے لوگ اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت اچھے ہیں۔ ان میں اتنی خوبیاں ہیں جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ تعصب نام کی کوئی چیز وہاں نہیں ہے، ذات برادری کا کوئی تصور نہیں ہے بس ایک رشتہ جو سب کو جوڑے ہوئے ہے... اخوت، مساوات اور ایمان کا وہ مضبوط رشتہ جو ایل ایمان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیتا ہے... وہ دن جو مدینہ کی پر نور، پاکیزہ فضا میں گزرے کبھی بھلائے نہیں جاسکتے... بقول شمیم جے پوری مرحوم۔

پھر آج تک ہوا نہ میسر کہیں شمیم

جو زندگی کا لطف مدینے میں آگیا

عمر کے اس آخری مرحلے میں تمنا ہے کہ دنیا کی زندگی کا جو وقت بھی اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے وہ اس نورانی شہر میں گزر جائے اور جنت البقیع کے قبرستان کی مٹی میں میرا یہ بدن سما جائے... آمین۔